

پاکستانی معاشرے کی عظیم اکثریت (□□ فیصد) مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ اور کسی بھی انسانی معاشرے کی طرح یہاں بھی لوگوں کی دینی ضروریات، عبادات کی ادائیگی، مذہبی تعلیم اور روزمرے امور میں دینی راہنمائی کے کسی نہ کسی نظام کی موجودگی ناگزیر ہے۔ مدارس و مساجد اس ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ یوں مدارس میں تبدیلی کی بحث کے ضمن میں اس اہم ترین حقیقت کا ادراک ضروری ہے کہ □ بنیادی طور پر ان کا قیام معاشرے کی بعض اہم اور بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے عمل میں آتا ہے۔ اگر حکومتی سطح پر ان ضروریات کو پورا کرنے کا ایسا نظام قائم ہو جس پر عام مسلمان کو اطمینان اور اعتماد بھی ہو اور اس تک ان کی رسائی بھی ممکن ہو توجی طور پر مدارس کے قیام کی ضرورت خود بخود ختم ہو جائے گی۔

چنانچہ □ یا سیدھا سادہ □، طلب اور رسد کا معاملہ □ ہے۔ طلب موجود ہے۔ ہر نئی قائم ہونے والی بستی میں ہے اور ملک کے ہر علاقے میں ہے۔ محض ان علاقوں میں ہی نہیں جو دینی رجحانات کے حوالہ سے مضبوط تر سمجھے جاتے ہیں بلکہ □ وہاں بھی جہاں عمومی طور پر دینی رجحانات نسبتاً کم نمایاں ہیں۔ معاشرے کے ان طبقات میں سے بھی، جو بظاہر آزاد خیال اور لیبرل سمجھے جاتے ہیں ایک بڑی تعداد اپنے بچوں کے لیے کم از کم بنیادی دینی تعلیم (قرآن پڑھنے کی صلاحیت) کا انتظام کرنا چاہتی ہے۔ اس ہمہ گیر طلب کے مقابلہ میں حکومت نے عمومی طور پر جو تعلیمی نظام ترتیب دیا ہے □ مقدار اور معیار کے اعتبار سے کسی بھی طرح معاشرے کی ضروریات پوری نہیں کرتا۔ مسلم معاشرے کی کم از کم دینی ضرورت قرآن کی تدریس □ کا تو اس میں کوئی انتظام ہی نہیں ہے۔ اس تناظر میں جہاں عمومی تعلیم کے لیے نجی تعلیمی اداروں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے وہاں اس پر کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ □ دینی تعلیم کے ادارے بھی دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں اور ان میں سے اچھے اداروں میں داخلوں کے لیے دباؤ اس طرح بڑھ رہا ہے کہ □ اب بہت سے ادارے داخلہ کے لیے باقاعدہ امتحانات منعقد کرتے ہیں۔

طلب اور رسد کا یہی اصول مدارس کی داخلی صورتحال پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ معاشرے میں عمومی رجحانات کی روشنی میں مدارس سے توقعات اگر محض دینی تعلیم کی فراہمی تک محدود ہیں تو کسی بیرونی دباؤ کے ذریعہ □ مدارس کو اس کے علاوہ □ کسی اور کام پر مجبور نہ کیا جا سکے گا۔ نہ ہی معاشرے میں اس عمل کو عمومی قبولیت حاصل ہو سکے گی کہ □ مدرسہ □ اپنی شناخت کو اس طرح تبدیل کر دے کہ □ دینی تعلیمی شناخت پس پشت چلی جائے۔ البتہ □ حالات □ واقعات کی روشنی میں معاشرے کی توقعات میں تبدیلی واقع ہو جائے اور اپنے بنیادی مقصد، یعنی دینی تعلیم اور اس حوالہ سے دینی تعلیمی شناخت کو متاثر کیے بغیر دینی اور عمومی تعلیم کے امتزاج اور مختلف سماجی □ اقتصادی دائروں میں ان سے کسی وسیع کردار کی امید رکھی جا رہی ہو تو طلب □ رسد کے اسی اصول کی بناء پر مدارس اپنے آپ کو تبدیل کرنے پر مجبور ہوں گے۔ خواہ □ اس سلسلہ میں بیرونی طور پر ان پر کوئی دباؤ ہوا نہ ہو۔ بلکہ □ اگر یوں کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ □ اس صورت میں □ بیرونی تعاون کے حصول کے لیے فکرمند ہوں گے تاوقتیکہ □ اس بیرونی تعاون کے ساتھ کوئی مخصوص شرائط وابستہ □ ہوں اور تعاون کرنے والے افراد اور اداروں سے انہیں کوئی خدشات لاحق نہ ہوں۔ □

طلب □ رسد کے پس منظر میں مدارس میں داخلی طور پر تبدیلی کا ایک اور عمل اس تناظر میں ہے کہ □ مختلف شعبوں میں راہنمائی کے حصول کے لیے مدارس سے عام لوگوں کا رابطہ □ کن امور پر ہے اور □ کی سرپرستی کرنے والے افراد کی ان سے توقعات کیا ہیں۔ اس ضمن میں □ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ □ مدارس سے عام لوگوں کا رابطہ □ اب محض روزمرہ فقہی معاملات تک محدود نہیں بلکہ □ ایک جانب پیشہ ورانہ □ امور، مثلاً بنکاری، بیمہ □ کاری، اور دیگر حوالوں سے اسلامی قوانین کے بارے میں استفسارات ہوتے ہیں، دوسری جانب بیرونی ممالک میں پاکستانیوں کی بڑی تعداد کی موجودگی اور ان کی نئی نسلوں کی وہیں پرورش، اقلیتی معاشرے میں اسلامی زندگی کے مسائل پر راہنمائی کی طالب ہوتی ہے۔ نیز نئی نئی ایجادات □ کے حوالہ سے پیدا ہونے والے سوالات پر بھی لوگ ان سے راہنمائی کے طالب ہوتے ہیں۔

چنانچہ □ راہنمائی کی یہ □ طلب اب محض اس محلہ □ یا علاقہ □ تک محدود نہیں جہاں مدرسہ □ واقع ہے بلکہ □ دوسرے ملکوں اور معاشروں تک پھیلی ہوئی ہے۔ ایسے میں فطری طور پر □ مدارس جن سے اس ضمن میں رجوع کیا جاتا ہے اپنے آپ کو اس راہنمائی کے لیے تیار کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ گلوبلائزیشن اور زندگی کے مختلف دائروں میں میڈیا کے بڑھتے ہوئے اثرات نے بھی انہیں مجبور کیا ہے کہ □ و □ اپنے آپ کو محدود رکھنے کی بجائے وسیع تر دائرے میں متحرک کریں اور نئے نئے آنے والے سوالات کا سامنا کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کریں۔ اس ضمن میں ان بیرون ملک پاکستانیوں نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا ہے جو مدارس کے ساتھ مالی تعاون اور سرپرستی کرتے ہیں۔ اپنے اپنے علاقوں میں ان میں سے بہت سوں کی دلچسپی محض مدرسہ □ کے قیام کی حد تک ہی نہیں ہوتی بلکہ □ و □ اسے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو بیرونی دباؤ کی مزاحمت کے باوجود ان مذکورہ عوامل کی بناء پر مدارس میں تبدیلی کے حوالہ سے ایک فطری عمل جاری ہے۔ تبدیلی کے لیے اجتماعی فیصلوں کی رفتار سست ہے تاہم تبدیلی کا ایک عمل اس فکر اور طرز عمل کی بناء پر جاری ہے جو قائدانہ حیثیت کے مالک مدارس اور علماء اپنے اپنے انفرادی دائروں میں اختیار کرتے ہیں۔

مدارس کی تاریخ، ان کی ساخت اور ان کے اندرونی نظام پر سرسری نگاہ □ ڈالنے سے یہ بات سمجھنا مشکل نہیں کہ □ ہر مدرسہ □ بنیادی طور پر اپنی جگہ □ ایک خود مختار ادارہ □ ہوتا ہے جس کی شناخت اس کے بانی (اور اس کی جانشین قیادت) کے ساتھ وابستہ □

ہوتی ہے۔ چنانچہ اب سے کچھ عرصہ قبل تک نظام و نصاب کے معاملہ میں مدارس وفاق کے تحت کسی باہم مربوط نظام کے بجائے مادر علمی کے نظام کے نصاب کو اختیار کرتے تھے (وفاق المدارس العربیہ) تاسیس ۱۹۵۵ء، تنظیم المدارس پاکستان تاسیس ۱۹۶۶ء اور نشاۃ ثانیہ جنوری ۱۹۷۴ء، وفاق المدارس الشیعہ ۵ کی دہائی سے کام کر رہا ہے لیکن باقاعدہ رجسٹریشن ۱۹۷۷ء میں ہوئی رابطہ المدارس الاسلامیہ نے ۱۹۷۷ء میں کام کا آغاز کیا۔ وفاق المدارس السلفیہ نے ۱۹۷۷ء میں آغاز کیا اور ۱۹۷۷ء میں رجسٹرڈ ہوئی۔

گو انفرادی طور پر مدرسہ کی شناخت کا تعلق اب بھی بانی مدرسہ اور اس کی جانشین قیادت کے ساتھ وابستہ ہے لیکن سیاسی، سماجی اور ابلاغی دائروں میں اسلامی فکر، اسلامی تعلیمات اور اسلامی نظام کے حوالہ سے جاری نظریاتی و عملی کشمکش نے معاشرے میں جس نوعیت کی تقسیم پیدا کی ہے اس نے مدارس کو باہم قریب تر کر دیا ہے۔ ان مسلسل تبدیل ہوتے ہوئے حالات کے تحت اب تمام ہی مسالک کے مدارس اپنے اپنے وفاق کے نظام کے نصاب کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ وفاق کے طے کر دہ نظام کے نصاب میں اضافہ تو کوئی مدرسہ اپنے ذمہ داران کے فیصلوں کے مطابق کر سکتا ہے لیکن اس نصاب میں کمی یا کسی جوہری تبدیلی کی صورت میں اس کی حیثیت متاثر ہو سکتی ہے۔ یوں اب مدرسہ کی شناخت وفاق کے ساتھ بھی منسلک ہو گئی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر تبدیلی کا ایک اور پہلو ہے کہ حکومتی دباؤ اور عالمی سطح پر غیر معمولی دلچسپی نے (جو اکثر صورتوں میں اضافی دباؤ کا سبب ہے) علیحدہ علیحدہ مسلک کی بنیاد پر قائم مدارس کے پانچ وفاقوں کو بھی باہم مربوط کر دیا ہے۔ چنانچہ اب ایک نیا ادارہ "اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ" وجود میں آ گیا ہے۔ اس وقت تک اس ادارہ کا کام حکومت سے مذاکرات میں مشترکہ موقف اور حکمت عملی اختیار کرنا ہے تاہم اس عمل میں وفاق ایک دوسرے سے قریب تر رہے ہیں۔ فطری طور پر اس قربت کے غیر محسوس اثرات ان کے نظام و نصاب پر بھی پڑیں گے۔

اس حقیقت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ خود اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ کی جانب سے مذاکرات کے عمل میں حکومت کو یہ تجویز دی گئی کہ آغاخان تعلیمی بورڈ کی طرح دینی مدارس کے تعلیمی امتحانات کے نظام کو بھی سرکاری سطح پر تسلیم کیا جائے پھر دینی مدارس کے وفاقوں کے نظام امتحانات کو مربوط اور یکساں معیار پر رکھنے کے لیے حکومتی سطح پر کوئی نگران بورڈ قائم کیا جائے۔ مرکزی حکومت یہ تجویز اصولی طور پر منظور کر چکی ہے، تاہم "انٹر مدرسہ بورڈ" کا قیام ابھی تک عمل میں نہیں سکا۔ اس فیصلہ کے مطابق چے ٹرمین اور وائس چیئرمین سمیت اس بورڈ کے کل سات ارکان ہوں گے، جن میں وائس چے ٹرمین اور دو ارکان اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ کے نامزد کردہ ہوں گے۔ تین ارکان حکومت (وزارت ہائے تعلیم، مذہبی امور اور داخلہ سے ایک ایک) کے نامزد کردہ ہوں گے۔ اس بورڈ کا چے ٹرمین کون ہو گا، اس پر ابھی اتفاق نہیں ہو سکا ہے۔ نیز تجویز کو عملی شکل دینے کے لیے قانون سازی کا مرحلہ بھی درپیش ہو گا۔

اسی طرح مرکزی سطح پر وزارت تعلیم کے تحت "انٹربورڈ کمیٹی آف چے ٹرمین" یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ منظور شدہ دینی مدارس کے طلبہ جو شہادۃ الثانویہ العامہ کی سند رکھتے ہوں اور کسی سرکاری تعلیمی بورڈ یا علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے میٹرک کے اردو، انگریزی، ریاضی اور مطالعہ پاکستان کے مضامین پاس کر چکے ہوں، وہ میٹرک کے مساوی ہونے کا سرٹیفیکیٹ (SSEC) حاصل کر سکتے ہیں۔ جنوری ۱۹۷۷ء سے اطلاق ہو گا۔

نیز جو طلبہ شہادۃ الثانویہ الخاصہ کی سند رکھتے ہوں اور اردو، انگریزی اور ہیومنٹیز گروپ میں سے کوئی سے دو اختیاری مضامین پاس کر چکے ہوں وہ انٹرمیڈیٹ کے مساوی ہونے کا سرٹیفیکیٹ (HSSEC) حاصل کر سکتے ہیں۔ [حوالہ: حکومت پاکستان، وزارت تعلیم، انٹربورڈ کمیٹی آف چے ٹرمین چٹھی نمبر 3780-02/ES/IBCC بتاریخ ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۷ء]

عالمی حالات اور خطہ میں ہونے والی تبدیلیوں نے مدارس کے ذمہ داران کو ایک اور انداز سے بھی جائزہ لینے اور تبدیلیوں کی جانب متوجہ کیا ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے جامعہ عثمانیہ پشاور کے مہتمم مفتی غلام الرحمن (جو صوبہ سرحد میں ایم ایم اے کی حکومت کے دوران قائم ہونے والے تعلیمی کمیشن کے سربراہ بھی تھے) کی تحریر سے اس اقتباس پر نظر ڈالنا مفید ہو گا:

اسلامی سیاست کرنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ بلند ہمتی کا مظاہرہ کر کے رجال سازی پر توجہ دیں۔ ہم نے افغانستان کے حوالہ سے دیکھا کہ طالبان کو چھ سال حکومت کا موقع ملا لیکن رجال کار کے فقدان بلکہ قحط الرجال کا اندازہ بہت جلد ہوا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہماری سیاسی جماعتیں اپنی کارکردگی پر نظر ثانی کریں۔ صرف زندگی جود جہد کو محدود نہ رکھیں اور نہ کسی انتخابی موقع تک اپنی سرگرمیاں محدود رکھیں بلکہ ضروری ہے کہ جہد مسلسل اپنی عادات بنائیں اور ہر وقت انتخابات کے ایام سمجھتے ہوئے محنت کریں۔

دینی مدارس کی اس میدان میں بھی کارکردگی مایوس کن ہے۔ ہمارے سب کے ارادے آسمان سے باتیں کرتے ہیں دنیا کے کونے کونے تک یہ پرواز کے لیے پر تولتے ہیں لیکن کبھی یہ نہیں سوچتے کہ وہاں کے تقاضے کیا ہیں؟ وہاں کی ضروریات کیا ہیں؟ وہاں کن حالات سے ہمارا سامنا پڑے گا؟ بدقسمتی سے ہم نعوں کے میدان میں گرم رہتے ہیں لیکن عملی میدان کی خیر نہیں لیتے۔ آج پوری دنیا سمٹ کر ایک گاؤں کی مانند ہو چکی ہے۔ فاصلے ختم ہوئے ہیں اور ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچنا گھنٹوں کی بات ہے اور یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ دنیا کے تقاضے مختلف ہیں، ان کے ادراک کے بغیر میدان عمل میں متحرک رہنا مشکل ہے۔ اس لیے ہمارے تعلیمی اداروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ نونہال طلبہ کی تربیت میں عصری مشکلات کا ادراک ضرور کریں خاص کر بڑی دینی جامعات جن کو وسائل میسر ہوں وہ وسعت ظرفی کا مظاہرہ کر کے اس میدان میں جوہر

کمالات دکھائیں۔ اور دوسرے مدارس کے لیے ایک قابل عمل راہ متعین کریں۔ ہمارے جامعے عثمانیہ جیسے نو وارد مدارس کی خواہش بہت ہے لیکن بدقسمتی سے ظروف اور وسائل کی تنگ دامنی اور تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے آگے قدم لینا مشکل ہے بلکہ ہمارے جیسے ناتجربہ کاروں کے لیے خطرات زیادہ ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہواندھوں کی طرح ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے گمراہی کے شکار ہوں اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے۔ ہاں جب امہات مدارس اس میدان میں پیش قدمی کریں تو چھوٹے مدارس کے لیے چلنا آسان ہو گا یہ بھی ضروری ہے کہ اس معاملہ پر مدارس کے باہمی مباحث کا اہتمام ہو۔ چاہیے کہ یہ ذمہ داری مدارس کی تنظیم میں وفاق المدارس جیسے ادارے نبھائیں اور اگر یہ ادارے غفلت کا مظاہر کریں تو پھر بڑی بڑی دینی جامعات خود کسی قدم لینے کے لیے بسم اللہ کریں ایسا نہ ہو کہ ہمارے طلبہ کل مستقبل میں ناکامی کے شکار ہو کر سب کچھ ہمارے کندھوں پر ڈال دیں (ماہنامہ العصر، جامعہ عثمانیہ پشاور، فروری ۱۹۹۹ء، ۴-۳)۔

مذکورہ بالا تناظر کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ بات سا منہ آتی ہے کہ مدارس کی بقاء کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ خود اپنی سطح پر اپنے آپ کو عصری حالات اور ضروریات کے نقطہ نظر سے تیار کریں تاکہ وہ معاشرے سے بالکل غیر متعلق نہ ہو جائیں۔ مدارس میں اس امر کا احساس کسی نہ کسی درجہ میں موجود ہے اور وہ اپنی اپنی سطح پر کچھ اقدامات بھی کر رہے ہیں۔ تاہم روایت پسندی اور احتیاط کا طرز عمل اور بسا اوقات وسائل کی قلت ایسے اقدامات کی راہ میں رکاوٹ بھی بن جاتی ہے۔ اپنی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے علم و فن کے میدانوں میں ہونے والی ترقی اور اس حوالہ سے نئے دائروں میں آگے بڑھنے کی اندرونی خواہش کے تناظر میں اقدامات کی رفتار کیا ہے۔ روایت پسندی یا تبدیلی کے بارے میں عمومی طور پر احتیاط (یا خوف) کا رویہ، تبدیلی کے حوالہ سے مطلوبہ ماحول اور مطلوب انسانی وسائل کی کیفیت کیا ہے، مجموعی طور پر یہ عمل کس طرح ہو رہا ہے، اس کی نوعیت اور علامتیں کیا ہیں، اور موجودہ رجحانات کو دیکھتے ہوئے آئندہ مدارس میں تبدیلیوں کا کیا رخ ہو گا؟ یہی وہ سوالات ہیں جن کا جواب "دینی مدارس - تبدیلی کے رجحانات" کتاب میں بڑی دینی جامعات کے ذمہ داران کے انٹرویوز کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔

ماخذ: "دینی مدارس - تبدیلی کے رجحانات" از خالد رحمہ، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد

نوعیت: کتاب کا ایک باب